فقہی، علمی، تحقیقی مجلہ

سہ ماہی

منہاج

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۹۲ء

مدیر مسئول

حافظ غلام حسین

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

اسلام کا نظامِ قضاء
اور
قاضی کے اوصاف

ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی ، وفاقی شرعی عدالت ، حکومت پاکستان

قضاء کے معنی کسی شئے کے مکمل ہو جانے ، تمام ہو جانے ، ختم ہو جانے ، مٹ جانے ، ادا ہو جانے ، نافذ ہو جانے اور گزر جانے کے ہیں ۔ زہری کہتے ہیں کہ لفظ قضاء متعدد مفاہیم میں مستعمل ہے مگر ان سب میں جو معنی مشترک ہیں وہ کسی شئے کو یا کام کو ختم کر دینے اور مکمل کر دینے کے ہیں یعنی ہر اس عمل پر "قضاء" کے لفظ کا اطلاق ہوگا جو لازم اور واجب ہو اور اسے اچھی طرح اور بخوبی مکمل ، تمام اور ادا کر دیا جائے اور اس میں جو نفاذ اور اجراء کا پہلو ہے اس کی تکمیل کر دی جائے[1] اسی سے "قاضی" کا لفظ بنا ہے جس کے معنی ہیں " القاطع للامور المحکم لها " (جو معاملات کو نمٹا دے اور ان کو محکم کر دے)

ابن الشمنی کہتے ہیں کہ :

" القضاء فی اللغة عبارة عن اللزوم ولهذا سمی القاضی قاضیاً لانه یلزم الناس "

(از روئے زبان قضاء کے معنی لازم کرنے کے ہیں ، قاضی کو قاضی بھی اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا حکم لوگوں پر لازم کر دیتا ہے ۔)

---

[1] لسان العرب ، (در ذیل مادہ) ۔ ابن الاثیر ، النہایہ ، فی غریب الحدیث والاثر ۔ (در ذیل مادہ)

عربی زبان میں [illegible]

حکم کے لفظی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں ۔ چونکہ قاضی بھی لوگوں کو زیادتی اور ناانصافی سے روکتا ہے اس لیے اسے حاکم کہا جاتا ہے ۔ امام راغب فرماتے ہیں :

" الحکم ان یقضی لشیئ علی شیئ "[1]

(کسی شئے کا کسی شئے پر فیصلہ کر دینا حکم ہے)

قضاء کا اصطلاحی مفہوم

اسلامی شریعت کی اصطلاح میں احکام شریعت کے مطابق لوگوں کے باہمی نزاع ، دعووں اور جھگڑوں کو نمٹانا قضاء کہلاتا ہے ۔ چنانچہ ابن خلدون فرماتے ہیں :

" القضاء منصب الفصل بین الناس فی الخصومات حسمًا للتداعی قطعًا للتنازع الا انه بالاحکام الشرعیه المتلقاة من الکتاب والسنة "[2]

(قضاء ایسا منصب ہے جس سے لوگوں کے باہمی دعووں اور نزاع کو ختم کرنے کے لیے ان کے درمیان موجود مخاصمات کا فیصلہ ہوتا ہے مگر یہ فیصلہ قرآن وسنت سے مستفاد شرعی احکام کے مطابق ہونا چاہیے)

ابن فرحون "تبصرة الحکام" میں کہتے ہیں :

"حقیقة القضاء الاخبار عن حکم شرعی علی سبیل الالزام ومعنی قولهم قضی القاضی ای الزم الحق اهله والدلیل علی ذالك قوله تعالی فلما قضینا علیه الموت ای الزمناه وحکمنا به علیه وقوله تعالی فاقض ما انت قاض ای الزم ماشئت واصنع ما بدالك "[3]

---

[1] الراغب الاصفہانی ، المفردات

[2] ابن خلدون المقدمہ

[3] ابن فرحون تبصرة الحکام ، ص ۷ ، مصر ۱۹۷۳ء

کے معنی ہوں گے کہ قاضی نے صاحب حق پر حق لازم کر دیا اس کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے "فلما قضینا علیہ الموت" یعنی ہم نے اس پر موت لازم کر دی اور اس پر یہ حکم جاری کر دیا۔ اور یہ فرمان الٰہی "فاقض ما انت قاض" یعنی جو تو چاہتا ہے وہ لازم کر دے اور جو چاہتا ہے وہ کر گزر۔)

ابن الشحنہ نے قضاء کی یہ تعریف کی ہے:

"وفی الشرع یراد بالقضاء فصل الخصومات المنازعات"[1]

(شریعت میں قضاء سے جھگڑوں کے فیصلے کرنا اور نزاع کو ختم کرنا مراد ہے)

الجرجانی التعریفات میں کہتے ہیں کہ:

"ھو اظہار ما ھو ثابت"[2]

(امر ثابت کو ظاہر کر دینا۔)

الشربینی مغنی المحتاج میں کہتے ہیں کہ:

"الخصومة بین خصمین فاکثر بحکم اللہ تعالیٰ"[3]

(قضاء سے مراد ہے دو یا زیادہ متنازعہ فریقوں کے مابین اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جھگڑا ختم کر دینا۔)

عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں کہ:

"اظہار حکم الشرع فی الواقعة فیمن یجب علیہ امضاوہ"[4]

---

[1] ابن الشحنہ لسان الحکام ، مصر ۱۹۷۳ء
ابن مادہ شرح ادب القاضی ج ۱ ص ۱۲۶ ، ابن عابدین رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۲۔

[2] الجرجانی ، التعریفات ورذیل مادہ

[3] الشربینی الخطیب مغنی المحتاج ۹ / ۳۷۲ بیروت

[4] ایضاً

جاری کرنا لازم ہو جائے۔)

محمد اعلیٰ تھانوی نے قضاء کی یہ تعریف کی ہے۔

"قول ملزم یصدر عن ولایة عامة"[1]

(عام ولایت سے جاری ہونے والا لازمی فرمان۔)

قضاء کی اہمیت و ضرورت

اسلام میں منصب قضاء کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ رسول اور پیغمبر بھی عدل و انصاف کی بالادستی استوار کرنے، انصاف کی ترازو قائم کرنے اور انسانیت کے معاملات عدل پر استوار کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے زمین و آسمان عدل اور قسط پر ہی قائم اور استوار ہیں۔ غرض اسلام میں قضاء کا منصب ایک بلند ترین منصب اور ایک عظیم ترین فریضہ ہے کیونکہ اس منصب کے ذریعہ انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ حق دار لوگوں کو ان کے حقوق دلائے جاتے ہیں، ظالموں کی گرفت کی جاتی ہے اور طاقتوروں کو کمزوروں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز رکھا جاتا ہے۔ یہ منصب قضاء ہی ہے جو معاشرے سے برائی کا خاتمہ کرتا اور شر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور سوسائٹی کو امن و سلامتی کی ایسی فضاء فراہم کرتا ہے جس میں رہ کر لوگ سکون کو اطمینان کے ساتھ اپنی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے جد و جہد کریں اور بلا خوف و خطر ایک ترقی یافتہ مہذب اور صالح معاشرے کو نشوونما اور فروغ دیں۔ اسی لیے اسلام "مقسطین" کو اللہ سبحانہ کے محبوب بندے قرار دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

"ان اللہ یحب المقسطین" (المائدہ ۵ : ۴۲)

(اللہ تعالیٰ پورا پورا عدل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] محمد اعلیٰ التھانوی کشاف اصطلاحات الفنون ۲/۱۲۳۳، کلکتہ ۱۸۶۲ء، الفتاوی الہندیہ ج ۳ ص ۳۰۷۔

"وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیه من الکتاب ومهیمنا علیه فاحکم بینهم بما انزل الله ولا تتبع اهواءهم عما جاءک من الحق" (المائدہ : ۴۸)

(اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے حق کے ساتھ، اس سے پہلے جو کتابیں آئی ہیں ان کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ ہے، لہذا ان لوگوں کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلے کیجیے اور اس حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے۔)

ایک مقام پر فرمایا :

"قل امر ربی بالقسط" (الاعراف : ۲۹)

(آپ کہدیجیے کہ میرے رب نے مجھے کامل عدل وانصاف کا حکم دیا ہے۔)

ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے :

"وان حکمت فاحکم بینهم بالقسط، ان الله یحب المقسطین" (المائدہ : ۴۲)

(اور اگر فیصلہ کرنا چاہو تو انصاف کا فیصلہ کرنا کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔)

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل" (النساء : ۵۸)

(جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔)

منصب قضاء اور فراہمی عدل کی اسلام میں اس قدر عظیم اہمیت ہے کہ زمین وآسمان اسی پر استوار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی اتنی بڑی نعمت قرار دیا ہے کہ اس پر حسد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"لا حسد الا فی اثنتین رجل آتاہ الله مالا فسلطه علی هلکته

فی الحق وآخر آتاہ الله حکمة فهو یقضی بها وتعلمها"

(صرف دو اشخاص ہیں جن پر حسد کیا جا سکتا ہے ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال عطا کیا اور حق کے راستے میں اسے خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور دوسرا وہ شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکمت اور دانائی سے نوازا اس نے اس کے مطابق فیصلے لیے اور اس کی تعلیم دی)[1]

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"هل تدرون من السابقون الی ظل الله یوم القیامة قالوا الله اعلم ورسوله قال الذین اذا اعطوا الحق قبلوه واذا سئلوه بذلوه واذا حکموا للمسلمین حکموا کحکمهم لانفسهم"[2]

(کیا تمہیں معلوم ہے کہ روز قیامت اللہ کے سائے کی جانب سبقت کرنے والے کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ لوگ جنہیں حق بات کہی جائے تو وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، جب ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ ضرورت پوری کرتے ہیں اور جب مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کریں تو اس طرح فیصلہ کرتے ہیں جیسے وہ اپنی ذات کے لیے کر رہے ہوں۔)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے :

"لان اقضی یوما احب الی من عبادة سبعین سنة"[3]

(میرے نزدیک ایک دن کی قضاء ستر (۷۰) سال کی عبادت سے افضل ہے)

احادیث میں جہاں منصب قضاء کی اہمیت اور فضیلت کو مثبت صورت میں اجاگر کیا گیا ہے وہاں متعدد احادیث ایسی بھی ہیں جن میں قضاء اور فراہمی عدل کی نزاکت اور اس میں کسی طرح کی کوتاہی

---

[1] صحیح البخاری بحاشیۃ السندی، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم ۱/۲۲ ؛ مسند الامام احمد حنبل ۱/۳۸۵، ۴۳۲

[2] مسند الامام احمد بن حنبل ۶/۶۷

[3] الطرابلسی، معین الحکام ص ۸ ، الطبعۃ الثانیہ ۱۹۷۳ء

... وظیفہ کا پہلو بھی واضح ہوتا ہے۔ ترہیب اور وعید کا یہ پہلو بھی قرآن کریم کی اس آیت کی توضیح ہیں اور تشریح ہیں۔

"واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبًا" (الجن ۱۵)

(ناانصافی کرنے والے جہنم کا ایندھن ہیں۔)

یعنی قضاۃ کی ترہیب اور وعید پر مشتمل احادیث کا مقصود قضاء سے روکنا نہیں بلکہ ظلم سے باز رکھنا ہے کیونکہ عدل گستری کے کام میں خواہش نفس کی پیروی اور ظلم و ناانصافی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اس لیے وعید کو ترہیب کے پہلو پر مشتمل عدل و انصاف سے گریز کرنے والے قاضیوں پر محمول کیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"من ولی القضاء ذبح بغیر سکین"[۱]

اس حدیث میں جہاں ایک پہلو وعید اور ترہیب کا ہے وہاں اس میں نمایاں پہلو قضاء کی فضیلت اور اس کی عظمت کا ہے کہ منصب قضاء کا حامل شخص اپنے نفس سے مجاہدہ کرتا ہے اپنے نفس کی خواہشوں سے جہاد کرتا ہے، دور و قریب کی مخالفتیں مول لیتا ہے اور محض حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ذبیح عدل و انصاف ہونے میں کیا شبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے منصب قضاء کے قبول کرنے کو ایسی کڑی آزمائش قرار دیا ہے جس میں ہلاکت کا اندیشہ موجود ہے اور نجات کا راستہ بڑا دشوار اور کٹھن ہے[۲] ظاہر ہے کہ اس کا مقصود "قضاء" کو شجر ممنوعہ قرار دینا نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اور نزاکت کو واضح کرنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"ان اعتی الناس علی اللہ وابغض الناس الی اللہ وابعد الناس من اللہ رجل ولاہ اللہ من امر امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شیئا فلم یعدل بینھم"[۳]

---

[۱] سنن ابی داؤد (اول کتاب الاقضیہ) ۲/۱۱۳ طبع بیروت، جامع الترمذی کتاب الاحکام ۳/۲۰۵

[۲] معین الحکام ص ۸

[۳] سنن ابی داؤد، اول کتاب الاقضیہ ۳/۱۱۳، طبع بیروت

(اللہ کا سب سے نافرمان اور سب سے ناپسندیدہ شخص اور تمام لوگوں میں اللہ سے زیادہ دور وہ شخص ہے جسے اللہ نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معاملہ کا والی بنایا ہو اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے۔)

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

القضاۃ ثلاثۃ واحد فی الجنۃ واثنان فی النار فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضی بہ ورجل عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار[۱]

(قاضی تین ہیں، دو قاضی جہنم میں ہیں اور ایک قاضی جنت میں۔ وہ قاضی جس نے اپنے فیصلے میں حق کے مطابق عمل کیا وہ جنتی ہے اور وہ قاضی جس نے حق کو جانتے ہوئے ظلم و تعدی کی وہ جہنم میں جائے گا اور وہ قاضی جس نے بغیر علم فیصلہ کیا اور یہ کہنے سے شرمایا کہ میں نہیں جانتا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔)

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دراصل ظالم اور ناانصافی کرنے والا اور جاہل آدمی منصب قضاء کا اہل نہیں ہے اور ظالم اور جاہل قاضی جہنم کی وعید کے مستحق ہیں جبکہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا قاضی جنتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دادرسی اور عدل گستری کا فرض صرف وہ شخص انجام دے جو اس کا اہل ہو اور جو حق تک پہنچنے کی پوری سعی کرے اور حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی مکمل جدوجہد کرے۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد کے صحیح فیصلے تک پہنچنے کی سعی کو سراہا گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیح فیصلہ کرنے کی تعریف کی گئی۔ اسی حقیقت کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

"اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد فاخطاء فلہ اجر"[۲]

---

[۱] سنن ابی داؤد (کتاب الاقضیہ) ج ۲ ص ۱۱۳ طبع بیروت

[۲] ایضاً

(اگر قاضی نے فیصلہ کے وقت حق تک پہنچنے کی پوری سعی کی اور حق کے مطابق فیصلہ کیا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر اس نے فیصلے تک پہنچنے کی سعی کے باوجود غلطی کی تو اس کو ایک اجر ملے گا۔

قضاء کے لازم ہونے کے دلائل

اسلامی شریعت کی روشنی میں معاشرے میں منصب قضاء قائم کرنا اور اس فرض کو انجام دینا لازم اور ناگزیر ہے اور اس منصب کا لزوم قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔[1]

قرآن کریم کی وہ آیات جن سے فقہاء کرام نے قضاء کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے، یہ ہیں۔

"انا انزلنا الیك الكتاب بالحق لتحكم بین الناس بما اراك الله" (النساء: ۱۰۴)

(اے پیغمبر) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تاکہ خدا کی ہدایات کی مطابق لوگوں کے مقدمات فیصل کرو۔)

"وان احكم بینهم بما انزل الله ولا تتبع اهوآءهم" (المائدہ: ۴۹)

(اور یہ کہ تم ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔)

"فاحكم بینهم بالقسط" (المائدہ ۵: ۴۲)

(اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو)

"واذا حكمتم بین الناس ان تحكموا بالعدل" (النساء: ۵۸)

(اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔)

"فلا وربك لا یؤمنون حتی یحكموك فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً"

(النساء: ۶۴)

[1] السرخسی، المبسوط ج ۱۶ ص ۵۹ - ۶۰ طبع بیروت
ابن قدامہ - المغنی، ج ۹ ص ۳۴ مکتبہ الریاض

(تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں اور اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔)

"انما كان قول المؤمنین اذا دعوا الی الله ورسوله لیحكم بینهم ان یقولوا سمعنا واطعنا، واولئك هم المفلحون"

(النور: ۵۱)

(مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب خدا اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان میں فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔)

جہاں تک سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو یہ امر ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کے درمیان فیصلے فرمائے، اور آپ نے متعدد صحابہ کرام کو مختلف مقامات پر قاضی مقرر کرکے بھیجا۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی کو یمن کا قاضی، اور معاذ بن جبل کو بھی یمن کی جانب قاضی مقرر کرکے روانہ کیا اور آپ نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ کا والی اور قاضی مقرر فرمایا نیز آپ نے ارشاد فرمایا:

"لا یحل لثلاثة ان یكونون بفلاة الارض الا امّروا علیهم احدهم"[1]

(تین اشخاص اگر کہیں میدان میں بھی ہوں تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی بات روا نہیں ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا امیر مقرر کر لیں۔)

اور آپ نے ارشاد فرمایا:

"لا قدست امة لا یأخذ الضعیف فیها حقه غیر متعتع"[2]

[1] مسند الامام احمد بن حنبل ۲/۱۷۷
[2] سنن ابن ماجہ ص ۱۷۱، طبع کراتشی

(وہ قوم سرفراز نہیں ہوتی جس میں کمزور شخص بلا جھجک اپنا حق حاصل نہ کر سکے۔)

اور اجماع سے قضاء کی ضرورت اور اس کا اسلامی معاشرے کے لیے لازمی ہونا اس طرح ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے خود قضاء کے فرض کو انجام دیا، لوگوں کے درمیان فیصلے کیے حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرہ کا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا، اور ہر دور میں تمام مسلمان قضاء کی اہمیت اور اس کے لازم ہونے پر متفق رہے ہیں[1]

غرض جہاد اور امامت کی طرح قضاء کے فرض کفایہ ہونے پر اجماع ہے[2]

اسلام میں خلیفہ اس امر کا ذمہ دار ہے کہ وہ کی جملہ مصالح کی رعایت ملحوظ رکھے اور معاشرے میں در آنے والی ہر خرابی کا سد باب کرے اور اس امر کا اہتمام کرے کہ معاشرے میں عدل اور انصاف جاری ہو اور ظلم و ستم کا استیصال کیا جائے۔ لیکن چونکہ وہ دادگستری کے تمام فرائض خود انجام نہیں دے سکتا اور لوگوں کی مصالح کی تکمیل اور ان سے مظالم کے دور کرنے کے لیے منصب قضاء کا جاری کرنا ناگزیر ہے اس لیے خلیفہ پر قاضیوں کا تقرر اور عدلیہ کا استحکام واجب اور فرض عین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد نے قضاء کے لازم ہونے کو ایک عقلی اور ناقابل تنسیخ امر قرار دیا ہے[3]

امت کے جملہ موزوں اور اہل افراد پر بھی اجتماعی طور پر قضاء کے کام کی انجام دہی اور اس منصب کو قبول کرنا فرض ہے اس لیے کہ فرمان خداوندی ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط" (النساء: ۱۳۵)

(اے ایمان لانے والو انصاف کو قائم کرنے والے بن جاؤ)

لیکن چونکہ منصب قضاء دراصل امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کا ایک شعبہ ہے اس لیے امت کے موزوں اور اہل افراد پر اس ذمہ داری کا ادا کرنا فرض کفایہ ہے کہ بعض افراد کے اس

---

[1] الشیرازی المہذب ۲ / ۲۸۹

[2] ابن قدامہ، المغنی ج ۹ ص ۳۴

[3] بدائع الصنائع ۷/۲

ذمہ داری کے پورا کرنے سے تمام امت کی جانب سے یہ فرض ادا ہو جائے گا خود رسو
صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو قاضی مقرر کیا، فرمایا کہ اگر قضاء فرض عین ہوتی تو بعض
کو قاضی مقرر کرنا کافی نہ ہوتا[1]

طلب قضاء کی شرعی حیثیت

اسلام نے حکومت و ریاست میں "خلافت" کا تص
دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جملہ معاملات یا
وقیادت میں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ وہ ان اعمال کو اپنی مرضی سے انجام نہیں دیتا بلکہ
تمام امور کو اللہ کی سپرد کی ہوئی امانت کے طور پر انجام دیتا ہے۔ ریاست وقیادت کی تمام ذم
سب سے اہم اور وقیع ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس میں امانت کا پہلو بھی زیادہ غالب ا
راجح ہے۔ اصول یہ ہے کہ امین لوگوں سے خود مطالبہ نہیں کرتا کہ اس کے پاس امانت رکھ
جائے بلکہ لوگ جس پر اعتماد کرتے ہیں اور جس کو وہ خود امین سمجھتے ہیں اس کو اپنی امانت سپرد کر
ہیں۔ خلافت کا معاملہ ہو یا حکومت کا کوئی منصب ریاست و حکومت کی ذمہ داری ہو یا منص
قضاء کی طلب، ان سب میں اسلام کی رو سے یہی روح کارفرما ہونی چاہیے کہ یہ منصب کسی
استحقاق نہیں ہیں کہ انہیں طلب کیا جائے بلکہ درحقیقت یہ "امانت" اور ذمہ داریاں ہیں جن
ادائیگی تصور امانت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ منصب ا
اور قضاء کا طلب نہ کرنا ایسا کلی اصول نہیں ہے کہ جس میں کوئی استثناء نہ ہو بلکہ فقہاء کرام نے ا
اصول سے استثناء کی متعدد صورتیں بھی بیان کی ہیں۔

طرابلسی نے منصب قضاء کے طلب کرنے کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں:

۱۔ واجب و فرض۔ ۲۔ مباح۔ ۳۔ مستحب۔ ۴۔ مکروہ۔ ۵۔ حرام

۱۔ اگر کوئی شخص اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو یا عالم و عادل ہو اور اس ملک یا شہر میں کوئی
موجود نہ ہو یا قاضی تو موجود ہو لیکن اس کا تقرر جائز اور قانونی نہ ہو یا اس ایک شخص کے علاوہ
شہر میں کوئی اور شخص قاضی بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو یا اس کو یہ خدشہ ہو کہ اگر میں نے یہ منص

---

[1] مغنی المحتاج: ۴/۳۷۲ ، بدائع الصنائع: ۷/۲

نہ سنبھالا تو کوئی ایسا شخص یہ منصب سنبھالے گا جس کا تقرر درست اور جائز نہ ہوگا یا قضاء کا منصب کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جس کے ہاتھ میں اس منصب کا رہنا درست نہیں اور اس شخص کو ہٹانے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں کہ یہ شخص (جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے یا عالم عادل ہے) خود اپنے لیے اس منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو ان سب صورتوں میں اس شخص کے لیے یہ بات فرض عین ہوگی کہ اس منصب کو حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اس کی کوشش کرے بشرطیکہ اس کا مقصود لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور شریعت کے مطابق احکام کا نفاذ ہو۔

۲ - اگر کوئی شخص تنگدست اور نادار ہو اور عیالدار بھی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ منصب قضاء کے حصول کی کوشش کرے بشرطیکہ اس کی نیت صرف اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کی ہو۔ اسی طرح اگر منصب قضاء کے حصول سے اس کی نیت یہ ہو کہ اپنی ذات کسی ممکنہ خطرہ یا نقصان سے محفوظ رکھ سکے گا تو اس طرح کی صورتوں میں اس کے لیے ایسی کوششیں کرنا جائز ہے۔

۳ - اگر کوئی شخص عالم ہے اور اس کا علم لوگوں کی نظروں سے مخفی ہے اور سربراہ مملکت چاہتا ہے کہ قاضی مقرر کر کے اس شخص کو مشہور کر دے تاکہ ناواقف لوگ اس کے علم سے استفادہ کریں اور ضرورت مند لوگ اس کے علم قانون سے بہرہ ور ہوں یا اگر وہ شخص غیر معروف اور گمنام ہو، اس کو نہ لوگ جانتے ہوں اور نہ سربراہ مملکت جانتا ہو اور وہ یہ چاہے کہ کوشش کر کے قاضی بن جائے تاکہ لوگ اس کے علم سے واقف ہو سکیں تو ان صورتوں میں اس شخص کے لیے اس منصب کے حصول کی کوشش مستحب ہوگی اور اگر اس کی یہی نیت ہو تو کوشش کے نتیجہ میں اس منصب کا قبول کر لینا اس کے لیے مستحب ہوگا۔

۴ - اگر منصب قضاء کی کوشش اس لیے کی جا رہی ہو کہ منصب وجاہ اور اعلیٰ عہدہ کا حصول یا لوگوں میں بڑا بننا مقصود ہے تو پھر یہ کوشش مکروہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں ایسی کوشش حرام ہے تو بھی درست ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ آخرت کا گھر ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں کوئی برائی نہیں چاہتے اور نہ کوئی فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کار الٰہی لوگوں کے ساتھ میں ہے جو تقویٰ کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دولت مند ہے اور منصب قضاء کی تنخواہ لینے کی اس کو ضرورت نہیں ہے اور وہ مشہور بھی ہے، مزید شہرت کی اس

کو ضرورت بھی نہیں اور علم قضاء میں اس کی صلاحیتیں ابھی معروف ہیں تو ایسے شخص کے لیے منصب کے حصول کی کوشش کرنا مکروہ ہے۔

۵ - اگر منصب قضاء کی کوشش کوئی جاہل شخص کرے جس میں قاضی بننے کی کوئی اہلیت اور صلاحیت نہ ہو یا کوئی ایسا شخص منصب قضاء کے حصول کی کوشش کرے جو عالم تو ہو لیکن اس میں ایسی باتیں موجود ہوں جو اس کو فاسق اور بدکردار بناتی ہوں یا قاضی بننے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ قاضی بن کر اپنے مخالفین سے انتقام لوں گا یا فریقوں سے رشوتیں لیا کروں گا یا ایسے ہی خراب مقاصد ہوں تو ان سب صورتوں میں منصب قضاء کی حصول کی ہر کوشش حرام اور قطعاً ناجائز ہے [1]

الماوردی نے ان پانچ حالات کو حسب ذیل اسلوب میں بیان کیا ہے کہ طلب قضاء کی پانچ صورتیں ہیں:

۱ - مستحب ۔ ۲ - ممنوع ۔ ۳ - مباح ۔ ۴ - مکروہ ۔ ۵ - اختلافی صورت ۔

پہلی صورت اگر معاشرتی حالات ایسے ہوں کہ ظلم و ستم کی بنا پر یا حکومت کی بے بسی اور نااہلی کی بنا پر لوگوں کے حقوق ضائع ہو رہے ہوں اور جہالت اور مفاد پرستی کی بنا پر غلط فیصلے کیے جا رہے ہوں۔ اس صورت میں کسی شخص کا حقوق کی حفاظت اور صحیح فیصلوں تک پہنچنے کے لیے قضاء کا طلب کرنا مستحب ہوگا اور اسے اس کام پر اجر بھی ملے گا اس لیے کہ اس کا مقصود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

دوسری صورت کسی شخص کا اپنے دشمنوں سے انتقام لینے یا رشوت حاصل کرنے کے لیے قضاء کا منصب لینا گناہ ہے اور ممنوع ہے۔

تیسری صورت روزگار اور رزق حلال کے حصول کے لیے قاضی بنانے کی درخواست کرنا مباح ہے اس لیے کہ رزق حلال کا وسیلہ تلاش کرنا خود مباح ہے۔

چوتھی صورت کوئی شخص فخر و مباہات اور محض منصب بلند تک رسائی کی خاطر قضاء طلب کرے تو یہ مکروہ ہے۔

پانچویں صورت کوئی شخص محض خواہش اقتدار اور جذبہ حکمرانی کی تسکین کے لیے منصب قضاء طلب کرے تو اس صورت کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے۔

ہمارے مسلک کے فقہاء کے اس مسئلے میں تین اقوال ہیں :

۱۔ ایسے شخص کا طالب بننا اور سربراہ حکومت کا اس کی درخواست پورا کرنا دونوں مکروہ ہیں۔ یہ رائے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، مکحول اور ابو قلابہ اور ان فقہاء کی ہے جنہوں نے اس معاملے میں ذرا سخت رائے اختیار کرتے ہوئے سلامتی کو ترجیح دی ہے ان کی دلیل سعید بن ابی سعید کی یہ روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین"[1]

(جس نے قضا طلب کی گویا وہ بغیر چھری کے ذبح ہو گیا)

اصل بات یہ ہے کہ منصب قضاء ایک ملی امانت ہے اور اس بار امانت کے اٹھانے میں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس منصب کی ذمہ داریاں پوری نہ ہو سکیں اور ان میں کوتاہی رہ جائے یا منصب قضاء کا طالب کر نیوالا فی الواقع ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے سے عاجز ہو تو ان صورتوں میں وہ اس اہم فریضہ امانت کی ادائیگی سے قاصر رہے گا۔ خود قرآن کریم نے دین اسلام کی ذمہ داریوں کو امانت کہا ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس شخص کا منصب قضاء کو طلب کرنا اور سربراہ حکومت کا اس کی درخواست کو قبول کرنا مستحب ہے یہ حضرت عمر، حسن اور مسروق کی رائے ہے اور ان فقہاء کی رائے ہے اور ان فقہاء کی رائے یہ ہے جنھوں نے اس مسئلے میں قدرے توسع اور سہولت کا پہلو اختیار کیا ہے اور اس فرض کو نیکی اور تقویٰ کے کام میں تعاون قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

"من طلب القضاء حتی ینالہ فان غلب لہ جورہ فلہ الجنۃ وان غلب جورہ عدلہ فلہ النار"[2]

---

[1] الماوردی الاحکام السلطانیہ

[2] سنن ابی داؤد (الاقضیہ) ج ۲/ ۱۱۴

نیز ان فقہاء کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قضاء ایک ایسا فریضہ ہے جو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کے بغیر انجام نہیں پا سکتا اور اللہ سبحانہ نے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ تیسرا قول جو کہ زیادہ متوازن ہے اور بیشتر ان فقہاء کی رائے ہے جنہوں نے اس مسئلہ میں درمیانی راہ اختیار کی ہے یہ ہے کہ ایسے شخص کا طالب بننا مکروہ ہے مگر سربراہ حکومت کا اس کی درخواست کو قبول کرنا مستحب ہے۔ اس قول کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے فرمایا کہ :

"لاتسأل الامارۃ فانک ان اوتیتھا عن مسألۃ وکلت الیھا وان اوتیتھا عن غیر مسألۃ اعنت علیھا"[1]

(منصب طلب نہ کرو اگر مطالبہ پر دیا گیا تو تم اس کے ذمہ دار بنا دیے جاؤ گے اور اگر تمہیں بغیر طلب کے ملے تو تمہاری اس میں اعانت کی جائے گی۔)

منصب قضاء طلب نہ کرنا شرط نہیں ہے

علامہ الکاسانی فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے بطور قاضی تقرر کے جائز ہونے کے لیے عدم طلب شرط نہیں ہے۔ اس پر اجماع ہے لہٰذا عہدہ قضاء کے طالب کو قاضی مقرر کرنا جائز ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ایسا شخص منصفانہ فیصلہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ طلب کرنے والے شخص کو قاضی مقرر نہ کیا جائے کیونکہ ایسا شخص منصفانہ فیصلہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ طلب کرنے والے شخص کو قاضی مقرر نہ کیا جائے کیونکہ تہمت کا امکان موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا :

"من سال القضاء وکل الی نفسہ فمن اجبر علیہ ینزل اللہ علیہ ملکًا یسددہ"[2]

---

[1] صحیح البخاری (الاحکام) ۴/ ۲۳۴

[2] الجامع للترمذی ۳/ ۶۰۵ تحقیق فواد عبدالباقی

(جس نے (منصب) قضاء کی طلب کی سے ملے اپنے نفس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے گا اور جسے یہ منصب قبول کرنے پر مجبور کیا گیا اس پر اللہ فرشتہ نازل فرماتا ہے جو اسے راہ راست پر رکھتا ہے۔)

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ طالب قضاء کو منصفانہ فیصلہ کرنے کی توفیق عطا نہیں ہوتی جبکہ اس شخص کو یہ توفیق عطا ہوتی ہے جسے یہ منصب قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔

کیا منصب قضاء کا قبول کرنا لازم ہے؟ قاضی کی جملہ صلاحیتوں اور شرائط کے حامل شخص کو اگر منصب قضاء کی پیشکش کی جائے تو کیا اس پر قبول کرنا لازم ہے یا اسے رد کر دینے کا بھی اختیار ہے۔ اس مسئلے میں دو حالتیں ہیں۔

پہلی حالت یہ ہے کہ کسی شہر یا علاقے میں مناسب تعداد میں ایسے افراد موجود ہوں جو قضاء کے منصب کے اہل ہوں تو پھر اس شخص کے لیے جسے حکومت منصب قضاء سنبھالنے کے لیے کہے روا ہے کہ وہ اس منصب کو قبول کرے یا رد کر دے[1]

صحابہ کرام تابعین اور ان کے بعد متعدد اصحاب خیر وصلاح نے منصب قضاء قبول کیا ہے اور لوگوں کے درمیان قاضی بن کر فیصلے کیے ہیں۔ اس کے برعکس اموی دور کے آخر اور عباسی دور کے آغاز میں علماء کبار کی ایک خاصی بڑی تعداد نے قضاء کو قبول نہیں کیا چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ نے قضاء کا منصب قبول نہیں کیا۔ ابن عابدین کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو تین مرتبہ منصب قضاء کی پیشکش کی گئی آپ نے ہر مرتبہ انکار کیا اور اس پر آپ نے دس دن تک روز کوڑے لگوائے۔ امام احمد بن حنبلؒ کو جب کوڑے مارے گئے تو امام ابوحنیفہؒ کو یاد کر کے ان کے حق میں دعا کرتے تھے[2]

دراصل امام ابوحنیفہؒ نے وہ زمانہ پایا جس میں خلافت بنوامیہ سے منتقل ہو کر بنوعباس میں پہنچی۔ اس دور میں کوفہ ایک عظیم الشان تحریک کا مرکز تھا۔ یہیں ابوالعباس السفاح کی بیعت کی

---

[1] محمد فاروق النبهانی نظام الحکم فی الاسلام ص ۶۳۲

[2] تاریخ التشریع الاسلامی

تکمیل ہوئی۔ مروان بن محمد کی جانب سے مقرر عراق کے والی یزید بن ہبیرہ نے امام ابوحنیفہؒ کو منصب قضاء کی پیشکش کی جس پر آپ نے انکار کر دیا اور سزا دلوائی۔ یہ درست ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انکار کیا اور متعدد بار اس منصب کو رد کیا مگر اس سے حکومت اس قدر ناراض نہیں ہو سکتی کہ سزا دلوائے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت فقہاء کرام کا طریقہ کار یہ تھا کہ جس حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے اس کی جانب سے تفویض کیے گئے منصب کو بھی قبول نہیں کرتے کہ اس طرح حکومت کی تائید کا اظہار ہو جاتا تھا اور حکومتیں بھی مناصب کے حصول کے لیے اصرار اسی عملی تائید کے حصول کے لیے کیا کرتی تھیں[1]

دوسری حالت اگر کسی شہر میں قضاء کے منصب کے لیے ایک شخص کے سوا کوئی اور اہل شخص موجود نہ ہو تو اس شخص پر قضاء کا قبول کرنا فرض عین ہوگا اور وہ انکار پر گناہگار ہوگا[2]

اگر کسی بستی یا ملک میں کوئی ایک ہی شخص ایسا ہو جو قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کے لیے قاضی کا منصب قبول کرنا فرض عین ہو جاتا ہے اور اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ خود اس کے حصول کی کوشش کرے اور اگر پیشکش کیے جانے کے باوجود اس کو قبول نہ کرے تو اس کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ کام فرض کفایہ ہے کو اس شخص کے علاوہ کسی اور سے اس فریضہ کی انجام دہی ممکن نہ ہوگی[3]

امام احمد سے یہ قول مروی ہے کہ اگر قضاء کے منصب کی صلاحیت کا حامل ایک ہی شخص موجود ہے تب بھی اس پر قضاء کا قبول کرنا فرض عین نہ ہوگا چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک شخص کے سوا کوئی اور باصلاحیت شخص موجود نہ ہو اور اسے قضاء کے منصب کی پیشکش ہو مگر وہ قبول نہ کرے تو کیا وہ گناہگار ہوگا تو امام احمد نے فرمایا کہ نہیں وہ گنہگار نہیں ہوگا[4]

---

[1] خطیب البغدادی تاریخ بغداد ۱۳ / ۳۲۷

[2] بدائع الصنائع ۷ / ۳

[3] المہذب للشیرازی ۲ / ۲۸۹

[4] المغنی مع الشرح الکبیر ۱۱ / ۳۷۶

قاضی کے اوصاف

اسلام میں منصب قضاء کی اہمیت کے پیش نظر فقہاء کرام نے قاضی کے انتخاب کے لیے اس کی صلاحیت و اہلیت کا ایک معیار متعین کیا ہے تاکہ اسلامی مملکت کے لیے باصلاحیت اور موزوں افراد کا انتخاب کیا جاسکے جو فطری فہم و شعور کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ شریعت کے علوم سے آشنا اور عدل و انصاف کی بنیادی شرط، خدا ترسی سے بہرہ ور ہوں۔ فقہ کی کتابوں میں ان شرائط کے بیان میں تفصیل اور قدرے اختلاف بھی ہے مگر ان کا مرکزی محور یہی مذکورہ امور ہیں۔

ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ قاضی کی تین شرائط ہیں:

کمال ، عدالت ، صاحب اجتہاد ہونا۔

کمال کی دو قسمیں ہیں:

کمال احکام اور کمال خلقت

کمال احکام میں چار امور آتے ہیں:

بالغ ہونا ، عاقل ہونا ، آزاد ہونا اور مذکر ہونا

اور کمال خلقت میں تین امور شامل ہیں:

گویائی ، بینائی اور سماعت کا صحیح ہونا[1]

الکاسانی فرماتے ہیں کہ منصب قضاء کی اہلیت کی شرطیں یہ ہیں:

عقل ، بلوغ ، اسلام ، حریت ، بصارت ، نطق (قوت گویائی)، حد قذف (تہمت کی حد) کا سزا یافتہ نہ ہو۔

ان شرائط کی دلیل وہی ہے جو ہم شہادت (کی اہلیت) کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں۔ چنانچہ پاگل ، نابالغ ، کافر ، غلام ، نابینا ، گونگے اور حد قذف کے سزایاب کو منصب قضاء سونپنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قضاء کا تعلق باب ولایت سے ہے بلکہ یہ تو عظیم ترین ولایت ہے اور مذکورہ بالا لوگ سب سے ادنیٰ ولایت یعنی شہادت کے بھی اہل نہیں (ان کی گواہی قابل قبول نہیں

---

[1] المغنی ۱۱/۳۸۱

ہوتی) تو سب سے اعلیٰ ولایت کے تو وہ بدرجہ اولیٰ نااہل ٹھہرے۔

حنفی فقہاء کے نزدیک قاضی میں وہ اوصاف ہونے چاہئیں جو شاہد میں ہونے ضروری ہیں چنانچہ جو شخص شہادت کا اہل ہے وہ قضاء کا بھی اہل ہے[1]

بہرحال حنفی فقہاء نے قاضی کے حسب ذیل اوصاف کو بطور شرائط بیان کیا ہے۔

اسلام ، حریت ، عقل ، بلوغ ، سماعت و بصارت اور گویائی کا صحیح ہونا ، حد قذف نہ لگی ہو، حکمران کی جانب سے مقرر کیا گیا ہو[2]

مالکی مسلک کے فقہاء کے نزدیک منصب قضاء پر فائز ہونے کے لیے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

عادل ہونا ، مرد ہونا ، سمجھ دار ہونا ، علم فقہ سے واقف ہونا ، مسلمان ہونا ، بالغ ہونا ، عاقل ہونا ، آزاد ہونا ، فاسق نہ ہونا[3]

شافعی فقہ کے اعتبار سے قاضی بننے کی لازمی شرائط یہ ہیں:

مسلمان ہونا ، مکلف ہونا ، آزاد ہونا ، مرد ہونا ، سماعت کا صحیح ہونا ، منصب قضاء کی ذمہ داریاں پوری کرسکتا ہو[4]

حنبلی مسلک کے لحاظ سے قاضی کی شرائط حسب ذیل ہیں:

کمال عدالت ، اجتہاد ، بلوغ ، عقل ، حریت ، مرد ہونا[5]

غرض فقہاء کرام کی نظر میں قضاء ولایت اور اس کے لیے متعلقہ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسلیے ہم ذیل میں ان شرائط کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

---

[1] الزیلعی بتبیین الحقائق ۴/۱۷۵ طبع بیروت ، ابن نجیم البحر الرائق ۶/۲۸۳
[2] فتح القدیر ۶/۳۵۷ ، البحر الرائق ۶/۲۸۰ ، ۲۸۳
[3] الشرح الصغیر للدردیر ۴/۱۸۷ ، ۱۸۸
[4] الرملی نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج ۸/۲۳۶
[5] المغنی ۱۱/۳۸ ، ابن ابی الدم ادب القضاء ج ۱ ص ۲۷۱

اسلام جملہ فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قاضی کا مسلمان ہونا ضروری ہے اور غیر مسلم کا قاضی بنانا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام قبول شہادت کی بھی شرط ہے۔ اس لیے بدرجہ اولی قضاء کی بھی شرط ہونا چاہیے اور یہ کہ قضاء ولایت ہے اور کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے[1]

حریت غلام کو قاضی مقرر کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ غلام کی اپنی ذات کے بارے میں ولایت ناقص ہے چہ جائے کہ اسے کسی دوسرے پر ولایت حاصل ہو۔ نیز چونکہ غلامی قبول شہادت ہی سے مانع ہے۔ اس لیے فیصلے کے نفاذ اور ولایت (قضاء) کے انعقاد سے بدرجہ اولی مانع ہوگی اس شرط پر بھی فقہاء کرام کا اتفاق ہے کیونکہ بچہ مکلف نہیں ہے اور اسے اپنے نفس پر ولایت حاصل نہیں ہے تو دوسروں پر اس کو ولایت کیسے حاصل ہو سکتی ہے[2]

عقل قاضی کا فہیم و فطین ہونا شرط ہے۔ پیچیدہ معاملات و مسائل کے لیے عقل رسا اور فکر سلیم کی ضرورت ہے اور محض (اتنی عقل کافی نہیں ہے جتنی عام انسانوں میں ہوا کرتی ہے)

چنانچہ الماوردی فرماتے ہیں کہ:

"عقل کی شرط کے اعتبار پر اتفاق ہے مگر قضاء جیسے اہم منصب کے لیے صرف اتنی عقل کافی نہیں ہے جتنی عام انسانوں کو ضروری مدرکات کے سمجھنے کے لیے موجود ہوتی ہے اور جو تکلیف کا مدار ہے بلکہ ضروری ہے کہ قاضی ذہین و فطین اور صحیح قوت تمیز کا حامل ہو اور سہو اور غفلت سے بعید ہو تاکہ وہ اپنی فہم رسا کی مدد سے پیچیدہ، دشوار اور مشکل معاملات میں صحیح فیصلے تک پہنچ سکے[3]

مرد ہونا جمہور فقہاء نے منصب قضاء کے حامل کے لیے مرد ہونے کی بھی شرط عائد کی ہے اور ان کے نزدیک عورت کا قاضی بننا درست نہیں ہے اور اس کے

---

[1] الرملی نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج ۸/ ۲۲۶

[2] المغنی ۱۱/ ۳۸

[3] الماوردی الاحکام السلطانیہ

حسب ذیل دلائل ہیں:

۱۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"الرجال قوامون علی النساء" (النساء)

(مرد عورتوں پر سرپرست ہیں)

یعنی عقل اور رائے دونوں میں مرد قوام ہیں اس لیے عورتوں کو مردوں پر قوامیت نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ روایت ہے کہ جب کسریٰ (ایران کا بادشاہ) مرا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ ان کے بعد کون بادشاہ بنا ہے اس پر آپ کو بتایا گیا کہ کسریٰ کی بیٹی اس کے قائم مقام بنائی گئی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ"[1]

(وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنے معاملات عورت کے سپرد کریں)

اس حدیث سے فقہاء کرام کے استدلال کا انداز یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مذمت کا پہلو لیے ہوئے ہے اور فرمان نبوت میں جب امر کی برائی بیان کی گئی ہو وہ خود بخود ممانعت پر مشتمل ہوتا ہے اور جب امر کی ممنوعت وارد ہوئی ہو وہ فاسد اور غلط قرار پاتا ہے۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین میں سے کسی نے کسی عورت کو منصب قضاء سپرد نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا قاضی بننا درست نہیں ہے اس لیے اگر عورت کا قاضی بننا درست ہوتا تو اسلامی تاریخ کے بہترین ادوار عورت کی قضاء سے خالی نہ ہوتے[2]

امام ابو حنیفہ کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے اور ماسوا حدود و قصاص کے ہر معاملے

---

[1] صحیح البخاری المغازی کتاب النبی الی قیصر و کسریٰ ۳/ ۹۰

[2] الماوردی فاروق النبہان عبد الفتاح محمد ابو العینین القضاء و الاثبات فی الفقہ الاسلامی ۱۶

[3] الماوردی الاحکام السلطانیہ، ابو یعلی الاحکام السلطانیہ

[4] المغنی ۱۱/ ۳۸۰ ، القضاء و الاثبات ۱۷

میں فیصلہ دے سکتی ہے لیکن حدود و قصاص میں عورت کا قاضی بننا اور فیصلہ کرنا موزوں نہیں ہے۔

ابن جریر طبری اور ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ "قاضی" کے لیے مرد ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ عورت کا مفتی بننا جائز ہے تو اس کا قاضی بننا بھی جائز ہے۔

ابن جریر طبری اور ابن حزم کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ کتاب و سنت میں عورت کے قاضی بننے کی ممانعت کہیں مذکور نہیں ہے اگر عورت کا قاضی بننا ناجائز ہوتا تو یقیناً قرآن و سنت میں اس کی وضاحت ہوتی۔

۲۔ حضرت عمر بن الخطاب نے شفاء بنت عبداللہ کو بازار کا نگران مقرر کیا۔ یہ کام احتساب سے تعلق رکھتا ہے اور احتساب قضاء کا ایک شعبہ ہے۔

۳۔ چونکہ عورت کا فتویٰ دینا صحیح ہے اس لیے اس کا قاضی بننا بھی صحیح ہے۔

سماعت و بصارت و گویائی

ابن قدامہ نے فرمایا ہے کہ قاضی کے اوصاف میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کامل الخلقت ہو یعنی اس کی سماعت، بصارت اور گویائی کی قوتیں صحیح ہوں[1]

امام نووی نے المنہاج میں سماعت بصارت اور گویائی کو قاضی کی شرائط میں ذکر کیا ہے اور خطیب الشربینی نے وضاحت کی ہے کہ گونگے شخص کو قاضی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ اس کے اشارے قابل فہم ہوں[2]

اسی طرح الکاسانی نے ان تینوں کے صحیح اور درست ہونے کو قاضی کی شرائط قرار دیا ہے[3]

الماوردی نے ان تینوں اوصاف کو ایک عنوان سلامتی حواس کے تحت جمع کر دیا ہے سلامتی حواس سے ان کی مراد سلامتی اعضاء نہیں ہے بلکہ سماعت اور بصارت کی سلامتی مراد ہے یعنی یہ کہ قاضی نابینا نہ ہو کہ اس کے فرائض منصبی کا تعلق اسی سے ہے کہ وہ فریقین معاملہ کو اور گواہوں

---

[1] المغنی مع الشرح الکبیر ج ۹

[2] الخطیب مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الفاظ المنہاج ۴/۳۷۵

[3] بدائع الصنائع ۷/۳

کو دیکھ سکے۔ اسی طرح قاضی بہرا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے بصارت بھی لازمی ہے۔ غرض سماعت و بصارت ہی ایسے حواس ہیں جن کے ذریعہ انسان حق و باطل میں امتیاز کر سکتا ہے اور منصفانہ فیصلہ جاری کر سکتا ہے۔ چنانچہ الماوردی کہتے ہیں کہ

سماعت و بصارت کی سلامتی منصب قضاء کے لازمی امور میں سے ہے اسی کے ذریعہ حقوق ثابت ہوتے ہیں۔ طالب اور مطلوب کے درمیان امتیاز کا ذریعہ بھی یہی حواس ہیں۔ انہی حواس کے ذریعہ قاضی یہ معلوم کر سکے گا کہ کون شخص حق کا اقرار کر رہا ہے اور کون حق سے منکر ہے۔ غرض حق و باطل کی معرفت انہی حواس پر موقوف ہے۔ اس لیے نابینا شخص کا فیصلہ کرنا اور اس کا قاضی بننا درست نہیں ہے البتہ امام مالک نے اسے جائز کہا ہے۔ جیسا کہ امام مالک کے نابینا شخص کی گواہی بھی جائز ہے بہرے شخص کے قاضی بننے کے بارے میں بھی وہی اختلاف ہے جو اس کے امام بننے کے بارے میں ہے۔ بہرحال قضاء میں اعضاء کی سلامتی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ سربراہ مملکت کے لیے سلامتی اعضاء شرط ہے اس لیے معذور شخص بھی قاضی بن سکتا ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اس کے اعضاء سالم ہوں تاکہ وقار و تمکنت قائم رہے[1]

حد قذف میں تہمت یافتہ نہ ہونا

حنفی فقہ کی رو سے قاضی کو ان شرائط کا ضرور حامل ہونا چاہیے جو شاہد (گواہ) کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس لیے کہ قضاء اور فیصلے میں شہادت بنیادی اہمیت کا حامل امر ہے جب قاضی میں خود وہ اوصاف موجود نہ ہو جو ایک گواہ کے لیے ضروری ہیں تو اس کے لیے اس گواہی پر فیصلہ کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکے گا۔

قرآن کریم میں سورۃ النور میں قاذف (تہمت لگانے والے) کی سزا ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

"والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا باربعة شهداء
فاجلدوهم ثمانین جلدةً ولا تقبلوا لهم شهادةً ابداً،
واولئك هم الفاسقون" (النور: ۴)

(اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو

---

[1] الماوردی الاحکام السلطانیہ، ابویعلی الاحکام السلطانیہ ۲۱ طبع بیروت

ان کو اسی (۸۰) درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں)

اس آیت میں قاذف کے تین حکم بیان ہوئے ہیں۔ اسی کوڑے لگائے جائیں، اس کی شہادت قبول نہ کی جائے اور یہ کہ وہ فاسق ہے۔ اس کے بعد آیت میں توبہ اور اصلاح کا ذکر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کے الفاظ سے جو استثناء آیا ہے اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے۔ فقہائے کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں ہے یعنی توبہ اور اصلاح سے حد کی سزا ساقط نہیں ہوگی، فقہاء کرام کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اس کا تعلق تیسرے حکم سے ضرور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کہ اصلاح سے فسق کا حکم ختم ہو جائے گا اور قاذف فاسق باقی نہیں رہے گا۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ:

"مجرم نفس قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔ امام شافعی اور لیث بن سعد کے نزدیک وہ نفس قذف سے فاسق ہو جاتا ہے اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام مالک کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نفاذ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں"[1]

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک توبہ اور اصلاح کے بعد بھی قاذف کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت ہو جائے گا جبکہ آئمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) کے نزدیک توبہ اور اصلاح کے بعد قاذف کی شہادت قابل قبول ہوگی۔[1]

حنفی مسلک کے فقہاء قاذف کی شہادت کے رد ہونے کے بارے میں اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں بروایت عمرو بن شعیب از والد از جد خود نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدودا فى قذف"

---

[1] ابوبکر الجصاص احکام القرآن ۳/۲۷۱، بعد

(مسلمان باہم ایک دوسرے کے معاملے میں عادل ہیں ماسوا اس شخص کے جسے حد قذف لگی ہو)

اسی طرح حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو جو خط تحریر کیا اس میں آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا:

"المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدودا فى قذف"[1]

(مسلمان باہم ایک دوسرے کے معاملے میں عادل ہیں۔ سوائے اس شخص کے جسے حد قذف لگائی گئی ہو۔)

عدالت

کسی شخص میں "خدا ترسی اور پارسائی" کی حالت پائے جانے کو عدالت کہا جاتا ہے اور جس شخص میں عدالت پائی جائے اسے عادل کہتے ہیں فقہاء کرام نے کسی شخص میں خدا ترسی اور پارسائی موجود ہونے کے اپنے انداز اور اسلوب میں معیارات بیان کئے ہیں جن میں اگرچہ بظاہر تعبیر کا فرق پایا جاتا ہے مگر سب کا مدعا ایک ہی ہے۔

ابن الہمام فرماتے ہیں:

"هى ملكة وهيئة راسخة فى النفس تحمد صاحبها على ملازمة التقوى والمروة وهى صيانة النفس عن الادناس لايشينها عند الناس"[2]

(عدالت طبیعت میں راسخ ہو جانے والا ایک ملکہ اور ایک ایسی فطری ہیبت ہے جس کے تحت انسان تقویٰ اور مروت کی پابندی کرتا ہے۔ مروت کا مفہوم ان اخلاقی کمزوریوں سے پاک ہوا ہے جن کو لوگ بالعموم معیوب سمجھتے ہیں۔

الماوردی فرماتے ہیں:

"ان يكون صادق اللهجة ظاهر الامانة عفيفا عن

---

[1]

[2] ابن الہمام التحریر ۳۱۴ طبع مصر ۱۳۵۱ھ، وشرحہ التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج ۲/۲۴۲، وتیسیر التحریر لمحمد امین امیر بادشاہ ۳/۴۴

المحارم متوقیا المآثم بعیدا من الریب مامونا فی الرضا والغضب مستعملا المروۃ مثلہ فی دینہ ودنیاہ فاذا تکاملت فیہ فھی العدالۃ التی تجوز بہ شھادۃ والولایۃ فلم یسمع لہ قول ولم ینفذ لہ حکم[1]"

(عدالت سے مراد یہ ہے کہ صادق القول امین "پاکدامن پرہیزگار" شبہات سے محفوظ، خوشنودی خفگی میں (یکساں) "قابل اطمینان اور اپنے ہم رتبہ لوگوں کی طرح مروت کو کام میں لانے والا ہو جس شخص میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی وہ شہادت دینے کا اہل ہوگا اور یہی صفات ہیں جن پر منصب حکومت پر فائز ہونا موقوف ہے اور جن میں کسی ایک صفت کی کمی ہوگی اس کی شہادت معتبر ہوگی نہ حکم نافذ ہوگا)

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ:

العدالۃ ان یکون مجتنبا ولا یکون مصرا علی الصغائر ویکون صلاحۃ اکثر من فسادہ وصوابہ اکثر من خطئہ[2]"

(عدالت یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔ صالحیت کا پہلو فساد سے زیادہ ہو اور صواب خطاء سے زائد ہو۔)

بہر حال جمہور فقہاء منصب قضاء کے لیے عدالت کی شرط کے قائل ہیں اور فاسق کی چونکہ شہادت قابل قبول نہیں ہے اس لیے بدرجہ اولیٰ قضاء بھی جائز نہیں ہے۔

ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ:

فلا یجوز تولیۃ فاسق ولا من فیہ نقص یمنع الشھادۃ[3]

---

[1] الماوردی الاحکام السلطانیہ

[2] ابن عابدین ردالمحتار ۴ / ۴۱۳

[3] المغنی ۱۱ / ۳۸۱

(اس شخص کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے جو فاسق ہو یا جس میں کوئی ایسی کمی موجود ہو جس کی بنا پر وہ شہادت کا اہل نہ رہے)

الشربینی الخطیب کہتے ہیں:

"فلا یولی فاسق لعدم الوثوق بقولہ[1]"

(فاسق کی بات قابل اعتماد نہیں ہے اس لیے اسے قاضی نہیں بنایا جا سکتا۔)

بہر حال آئمہ ثلاثہ کے نزدیک منصب قضاء کے لیے عادل ہونا شرط ہے اور فاسق کا قاضی مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فاسق کا گواہ بننا درست نہیں ہے تو اس کا قاضی مقرر کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ فاسق کا قول مقبول نہیں ہے اس لیے قاضی ایسا شخص نہیں ہونا چاہیے جس کا قول ہی مقبول نہ ہو۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا[2]"

(الحجرات ۶)

(اے مومنو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو پس تم اس کی تحقیق کر لیا کرو۔)

حنفی فقہاء فرماتے ہیں کہ حالات زمانہ کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ فاسق کی قضاء کو درست قرار دیا جائے کیونکہ

"لو اعتبر ھذا انسد باب القضاء خصوصا فی زماننا[3]"

(اگر عدالت کی شرط کا اعتبار کیا جائے تو باب قضاء بند ہو جائے بالخصوص ہمارے زمانے میں۔)

علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ فقہ حنفی کے اعتبار سے عدالت قاضی کی شرائط جواز میں سے

---

[1] مغنی المحتاج ۴ / ۳۷۵

[2] ردالمحتار ۴ / ۴۱۳، المغنی ۱۱ / ۳۸۲

[3] ردالمحتار ۴ / ۳۳۳

نہیں ہے بلکہ شرائط کمال میں سے ہے۔ لہذا فاسق کو قاضی کا منصب سونپنا جائز ہے اور ایسے قاضی کے فیصلے نافذ ہوں گے بشرطیکہ وہ حدود شرعیہ سے متجاوز نہ ہوں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عدالت شرط جواز ہے۔ اس لیے ان کے مسلک کے بموجب فاسق آدمی قاضی بننے کا اہل نہیں کیونکہ ان کے نزدیک فاسق آدمی کی شہادت قابل قبول نہیں ہوتی، لہذا وہ منصب قضاء کا بھی اہل نہیں اس کے برعکس ہمارے فقہاء کے نزدیک چونکہ اس کی شہادت قابل قبول ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا قاضی مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ فاسق آدمی کو قضاء کا منصب تفویض نہ کیا جائے اس لیے کہ یہ منصب ایک عظیم امانت مال و اسباب اور جانوں کی امانت ہے۔ اتنی گرانقدر امانت کی ذمہ داری سے صرف ایسا آدمی عہدہ برآ ہو سکے گا جس میں ورع (گناہ سے اجتناب) درجہ کمال کی ہو اور وہ غایت درجہ متقی ہو ہاں بہرحال اگر کسی فاسق آدمی کو بطور قاضی تعینات کر دیا جائے تو یہ فعل بذات خود جائز ہے اور وہ شخص قاضی بن جائے گا کیونکہ وہ صفات خارجیہ کے لحاظ سے فاسد ہے اور یہ صورت حال اس کے تقرر کے جائز ہونے میں مانع نہیں ہے[1]

امام غزالی فرماتے ہیں:

"اجتماع هذه الشروط من العدالة والاجتهاد وغيره هما متعذر في عصرنا لخلو العصر عن المجتهد والعدل[2]"

(عدالت واجتہاد وغیرہ کی شرائط کا ہمارے دور میں پایا جانا دشوار ہے کیونکہ اس دور میں مجتہد اور عدل موجود نہیں ہے)

امام غزالی کا یہ جملہ نقل کر کے ابن الہمام فرماتے ہیں کہ

"فالوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذا شوكة وان كان جاهلا فاسقا وهو ظاهر المذهب عندنا فلو قلد

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع

[2] فتح القدیر ۶/ ۳۵۷

الجاهل الفاسق صح ويحكم بفتوى غيره ولكن لا ينبغي ان يقلد والحاصل انه ان كان في الرعية عدل عالم لا يحل توليته من ليس كذلك ولو ولي صح على مثال شهادة الفاسق لا يحل قبولها وان قبل نفذ الحكم بها وفي غير موضع ذكر الاولوية يعني الاولى ان لا تقبل شهادة وان قبل جاز ومقتضى بها فان جاز ونفذ[1]

(پس وجہ یہ ہے کہ ہر اس شخص کی قضاء نافذ ہو جسے صاحب اقتدار حکمران نے مقرر کیا ہو، اگرچہ وہ (قاضی) جاہل اور فاسق ہو۔ یہی ہمارا ظاہر مذہب ہے۔ اگر جاہل فاسق کو مقرر کر دیا گیا تو درست ہوگا اور وہ دوسرے کے فتویٰ پر فیصلہ دے گا لیکن جاہل ایسے شخص کو منصب قضاء پر مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اگر رعایا میں کوئی عادل اور عالم موجود ہو تو ایسے شخص کو قاضی مقرر کرنا جو ایسا نہ ہو درست نہیں ہے۔ لیکن اگر مقرر کر دیا گیا تو صحیح ہوگا۔ جیسا کہ فاسق کی گواہی کو اصلاً ایسے قبول کرنا درست نہیں ہے لیکن اگر قبول کر لی گئی تو اس پر فیصلہ صحیح ہے۔ ایک اور موقعہ پر مصنف نے اولویت کا بھی ذکر کیا ہے یعنی اولیٰ یہ ہے کہ فاسق کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور اگر قبول کر لی تو درست نہیں ہے کہ (فاسق کی) گواہی پر فیصلہ کرے لیکن اگر فیصلہ کر دے تو جائز بھی اور نافذ بھی ہوگا)

علم علم سے مراد احکام شرعیہ کا علم ہے جس کے لیے حسب ذیل چار امور کا علم ضروری ہے:

۱۔ کتاب اللہ (قرآن حکیم) میں بیان کردہ احکام کا علم

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم۔

۳۔ علمائے سلف کی آراء کا علم اور یہ جاننا کہ کون سے معاملات میں ان کا اجماع منقول ہے اور کون سے ایسے امور ہیں جن میں ان کی اجتہادی آراء مختلف ہیں۔

---

[1] فتح القدیر ۶/ ۳۵۷، ۳۵۸

۴۔ قیاس (اجتہاد) کا علم جس کے ذریعہ ان امور کو جن کا شرعی حکم موجود نہیں ان امور پر قیاس کیا جا سکے جن میں شرعی حکم موجود ہے۔[1]

ابن حبیب نے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قاضی کو عالم ہونا چاہیے[2] اور جو شخص احکام شریعت سے ناواقف ہو اسے قاضی مقرر نہیں کیا جائے گا۔[3] امام مالک غیر فقیہ (علم شریعت سے ناواقف) شخص کا قاضی مقرر کیا جانا ناپسند فرماتے تھے۔ اور انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یہ رائے پسند تھی کہ قاضی ایسا شخص ہو جو ارباب متقدمین کی آراء سے بخوبی واقف ہو۔[4] اس سلسلے میں حنفی مسلک کی رائے کو علامہ الکاسانی نے بہت عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک حلال وحرام اور دوسرے تمام احکام شرعیہ کے علم کا تعلق ہے تو کیا یہ تقرر کے جائز قرار پانے کے لیے بنیادی شرط ہے؟ ہمارے نزدیک یہ خود تقرر کے جائز قرار پانے کی شرط نہیں بلکہ اس کی حیثیت محض مستحب اور مندوب کی ہے۔ علمائے حدیث کے نزدیک قاضی کے تقرر کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ حلال وحرام اور تمام دوسرے احکام کا علم رکھتا ہو اور اس میں اس کو اجتہاد کا درجہ حاصل ہو۔ یہ نہ ہو تو اس کا بطور قاضی تقرر ہی غیر قانونی ہوگا۔ یہی بات وہ سربراہ مملکت کے بارے میں بھی کہتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک یہ شرط سربراہ مملکت کے لیے بھی ضروری نہیں۔ اس لیے کہ جس طرح سربراہ مملکت کے لیے یہ ممکن ہے کہ دوسرے علماء کے فتویٰ کی بنیاد پر معاملات کا فیصلہ کرے اسی طرح قاضی کے لیے بھی یہ ممکن ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو احکام شرعیہ سے بالکل ناواقف ہو قاضی مقرر کرنا مناسب نہیں۔ اس لیے کہ ایک ایسا شخص جو اپنے منصب اور ذمہ داریوں سے ناواقف ہوگا اس سے سنوارنے کی بہ نسبت

[1] الاحکام السلطانیہ (للماوردی) (لابی یعلی) ص ۶۱
محمد فاروق النبنہان نظام الحکم فی الاسلام ۶۲۸

[2] الشوکانی نیل الاوطار ۸/۲۹۹، بیروت

[3] مغنی المحتاج ۴/۳۷۵، نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج ۸/۲۲۶

[4] امام مالک المدونۃ ۵/۱۴۹

بگاڑنے کی زیادہ توقع ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر بالکل غلط اور باطل فیصلے بھی کر ڈالے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں ایک جنت میں ہوگا اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جو شخص علم رکھتا ہو اور اس علم کی بنیاد پر فیصلہ کرے وہ جنت میں ہوگا۔ اس کے برعکس وہ شخص جو علم تو رکھتا ہو لیکن فیصلے اس کے خلاف کرے وہ جہنم میں ہوگا۔ اسی طرح وہ شخص جو جاہل ہو اور جہالت ہی کی بنیاد پر جاہلانہ فیصلے کرے وہ بھی جہنم میں ہوگا۔" لیکن اگر کوئی ایسا ناواقف شخص بطور قاضی مقرر کر ہی دیا جائے تو اس کا یہ تقرر ہمارے نزدیک اپنی جگہ جائز ہوگا اس لیے کہ ایک ناواقف شخص بھی فقہاء وغیرہ سے فتویٰ لے کر دوسروں کے علم کی مدد سے فیصلے کر لینے پر بہرحال قدرت تو رکھتا ہے۔

ہاں جہاں تک درجۂ فضیلت اور درجۂ کمال کے حصول کی شرائط کا تعلق ہے تو یقیناً قاضی کو حلال وحرام اور دوسرے تمام احکام شریعت کے علم میں مرتبۂ اجتہاد کا حامل ہونا چاہیے۔ اسے لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں اور ان کے لین دین کے اصولوں سے بھی خوب واقف ہونا چاہیے۔ اس کو عادل، متقی، پاکباز، ہر قسم کے الزامات سے پاک، طمع ولالچ سے بری ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے منصب قضاء کا تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ذریعے فیصلہ کرے اور ان صفات کا حامل شخص طبعاً حق ہی کے مطابق فیصلہ کرے گا۔[1]

اجتہاد

جمہور فقہاء کے نزدیک قاضی کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت اور اجماع سے اور ان سے استدلال کے طریقے سے واقف ہو اور اجتہادی صلاحیت کا حامل ہو۔[2] ان کے نزدیک مقلد کا قاضی بننا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کو جو احکام شریعت میں مجتہدانہ صلاحیت نہ رکھتا ہو قاضی مقرر کرنا صحیح نہیں ہے اور اگر مقرر کر دیا جائے تو اس کی قضاء باطل ہوگی۔[3] ابن حزم کہتے ہیں کہ قاضی کے مجتہد ہونے کی شرط پر اجماع ہے۔[4]

[1] بدائع الصنائع ۷/۳

[2] المرادی الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف ۱۱/۱۷۸، ابن قدامہ المقنع ۴/۲۴۷،
مغنی المحتاج ۴/۳۷۵، نہایۃ المحتاج ۸/۲۲۶، نواب صدیق حسن خان،
ظفر الاضی بما یجب فی القضاء علی القاضی ص ۱۶ طبع پاکستان

[3] ابو یعلی الاحکام السلطانیہ ۶۲، الماوردی الاحکام السلطانیہ۔ [4] الانصاف ۱۱/۱۷۸

اجتہاد کی صلاحیت کا معیار یہ ہے کہ حسب ذیل چھ امور میں گہری بصیرت اور تفقہ حاصل ہو۔ قرآن کریم، سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع، اختلاف فقہاء، قیاس، عربی زبان[1]

حنفی فقہاء کے نزدیک اجتہاد قاضی کی شرائط لزوم میں سے نہیں بلکہ شرائط اولویت میں سے ہے یعنی ایسی شرط ہے جو اگر موجود ہو تو بہتر اور اولیٰ ہے اس لیے شریعت سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص مقرر کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی کی رائے اس کے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کو اس کام کے لیے مقرر کیا جائے کہ وہ فیصلے کرے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص اس کام کی قدرت اور صلاحیت بھی رکھتا ہو اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ علم ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں ایک ایسے قاضی کے لیے جو شریعت سے زیادہ واقف نہ ہو یہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے کسی صاحب علم شخص کے قانونی مشوروں (فتووں) کی روشنی میں فیصلے کرتا رہے۔ اس طرح منصب قضاء کا مقصد (یعنی فیصلے کرنا) پورا ہوتا رہے گا اور حق داروں کو ان کے حقوق ملتے رہیں گے۔

مناسب یہی ہے کہ کسی ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو اس کام کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو اور اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"جو شخص کسی شخص کو کسی کام پر متعین کرے اور اس کی قوم میں ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کام کے لیے اس شخص سے زیادہ موزوں ہوں تو اس نے ایسا کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور مسلمانوں کی پوری جماعت سے خیانت کی"[2]

قاضی کو لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ حق سے مراد وہ احکام ہیں جو ثابت شدہ طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اب اس ثابت شدہ ہونے کے کئی درجے ہیں۔

۱۔ یا تو حکم قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ ہوگا اور اسکے قطعی اور یقینی ہونے پر کوئی قطعی دلیل موجود ہوگی۔ مثلاً کتاب اللہ کا واضح اور صاف حکم، سنت متواترہ، سنت مشہورہ یا اجماع امت۔

[1] المغنی ۹/ ۴۱

[2] ابن تیمیہ: السیاستہ الشرعیہ: ص ۹ دار الکتب العربیہ بیروت

۲۔ یا وہ حکم ظاہری طور پر ثابت شدہ ہوگا اور اس پر کوئی ایسی ظاہری دلیل قائم ہوگی جس سے ظن غالب حاصل ہو جائے۔ یعنی کتاب اللہ یا سنت رسول (چاہے خبر واحد ہی سے ثابت ہو اور اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہو یا فقہاء سلف سے کوئی روایت موجود نہ ہو)

لہٰذا اگر قاضی کوئی ایسا فیصلہ کر دے جو کسی قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ حکم کے خلاف پڑتا ہو تو وہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک قطعی طور پر باطل اور کالعدم فیصلہ ہے۔ اسی طرح اگر قاضی کوئی فیصلہ کرے جو آج تک کے تمام قابل ذکر فقہاء کے اقوال سے بالکل ہٹ کر ہو تو بھی وہ فیصلہ جائز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ حق ان تمام اقوال و آراء سے باہر ہو۔

لہٰذا اگر قاضی اپنے اجتہاد سے کام لے کر کسی ایسے معاملہ میں کوئی فیصلہ کر دے جس میں کوئی ظاہری طور پر طے شدہ حکم قرآن و سنت میں موجود ہو اور وہ اس اجتہاد کے خلاف پڑتا ہو تو یہ فیصلہ بھی نافذ العمل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ نص کے مقابلہ میں قیاس کالعدم اور باطل ہوتا ہے۔ چاہے وہ نص ظاہری ہو۔ ہاں اگر وہ کوئی ایسا معاملہ ہے جس میں کوئی قطعی یا ظاہری نص موجود نہیں ہے تو اگر قاضی مجتہد ہے تو اس کو اپنی اجتہادی رائے کے مطابق فیصلہ دینا چاہیے۔ کسی دوسرے کی اجتہادی رائے کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔

اگر کوئی ایسا شخص قاضی مقرر کر دیا جائے جو مجتہد تو نہ ہو لیکن فقہ میں اس حد تک گہری نظر ضرور رکھتا ہو کہ اس کے دوسرے معاصرین کو وہ مقام حاصل نہ ہو تو امام ابو حنیفہ کے خیال میں ایسا شخص اجتہاد کر سکتا ہے۔ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک نہیں کر سکتا۔

اگر قاضی خود اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اگر اس کو صحابہ کرام کے اقوال و آراء معلوم ہیں تو ان میں سے جو قول اس کو حق کے قریب تر نظر آئے اس کو بطور تقلید اختیار کر کے اس پر عمل کرے ورنہ اگر صحابہ کے اقوال و آراء سے اس کو واقفیت نہ ہو تو اپنے زمانہ کے فقہاء کے فتویٰ پر عمل کرے اگر بالفرض اس کے زمانہ میں فقہ کا ماہر کوئی ایک ہی شخص ہو تو قاضی اس کی رائے پر عمل کر سکتا ہے[1]

[1] ابن نجیم البحر الرائق ۶/ ۲۵۴

قاضی کے ان اوصاف کا تعلق اجتہاد سے ہے اور فقہاء کرام نے جس طرح تفصیل کے ساتھ ان شرائط اور اوصاف کی تشریح اور توضیح کی ہے اس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی نظام حیات میں "قضا" (عدلیہ) کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قاضی کے مذکورہ اوصاف دراصل خوب سے خوب تر کی جستجو کے معیارات ہیں اور ان سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق نئے معیار بھی وضع کئے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ تمام شرائط کے ساتھ بعض اوصاف کمال بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً قاضی کا ورع و تقویٰ اور صدق وغیرہ۔ لیکن خود فقہاء نے یہ بھی فرمایا ہے:

"لیس علی وجه الارض احد جمع هذه الصفات ولکن یجب ان یطلب من اهل کل زمان اکملهم وافضلهم[1]"

(روئے زمین پر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ان تمام خوبیوں کا جامع ہو، بہرحال یہ امر لازم ہے کہ ہر دور میں جو زیادہ باکمال اور زیادہ بہتر لوگ ہوں فراہمی عدل کے لیے انہی کا انتخاب کیا جائے)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر دور اور ہر زمانے کی ضرورتوں اور حالات کے پیش نظر قاضی کے اوصاف مقرر ہونے چاہئیں۔ اور اس امر کو مدنظر رکھا جانا چاہیئے کہ بہتر سے بہتر افراد عدلیہ کیلئے منتخب ہو سکیں یعنی وہ علم شریعت اور قانون سے بخوبی واقف ہوں اور ان کا ذاتی کردار بھی عام متمدنی زندگی میں ممتاز نظر آتا ہو۔

---

[1] نیل الاوطار ج ۸ / ۲۹۹ ظفر اللاضی ۴۱